سبیلِ رب

دعوت الیٰ اللہ کا راستہ

مولانا سید جلال الدین عمری

فہرست

پیش لفظ ۷

حکیمانہ خطاب کی خصوصیات ۷

دعوت ۔حکمت سے ۷

۱۔مخاطب کا تعین ۸

۲۔موقع ومحل کی رعایت ۱۲

۳۔اصولِ دین مقدم ہیں ۱۲

۴۔طرزِ خطاب میں ملاطفت ۱۵

۵۔انذار اور تبشیر ۱۷

۶۔دنیا اور آخرت کی فلاح ۱۹

۷۔دین کا برحق ہونا دلائل سے ثابت کیا جائے ۲۳

۸۔مخاطب کی آمادگی ۲۹

موعظہ حسنہ ۳۰

موعظت کا صحیح طریقہ ۳۵

موعظت کے اصول اور آداب ۳۶

۱۔ہم دردی اور غم خواری کا مظاہرہ کیا جائے ۳۷

۲۔موعظت اللہ کے دشمنوں کو بھی کی جائے ۳۸
۳۔نصیحت جہاں فائدے کی توقع ہو ۳۸
۴۔مخاطب اکتاہٹ نہ محسوس کرے ۳۹

جدالِ احسن ۴۲
مشرکین سے جدالِ احسن ۴۳
اہلِ کتاب سے جدالِ احسن ۴۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

قرآن مجید نے 'سبیلِ رب' کی طرف دعوت کے لیے حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن کی راہ دکھائی ہے۔ اس میں دعوت کا حکم بھی ہے اور اس کے طریقہ کار کا بیان بھی۔

اس عاجز نے ۱۹۸۷ء میں ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں اپنے مضامین میں اس کی کسی قدر تفصیل پیش کی تھی۔ اب اکتیس (۳۱) برس بعد، ان مضامین کی طرف توجہ ہوئی اور وہ کتاب کی شکل میں پیش ہو رہے ہیں۔ سورۂ نحل میں 'سبیلِ رب' کی طرف دعوت کے لیے جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں، ان مضامین میں اس کی تفصیل قرآن ہی سے فراہم کی گئی ہے۔ اسے اس اجمال کی تشریح کہا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثارِ صحابہؓ سے بھی اس میں مدد لی گئی ہے۔

ان مضامین کو کتاب کی صورت میں پیش کرنے سے قبل ان پر نظر ثانی ہوئی ہے اور کہیں کہیں نئے مواد کا اضافہ ہوا ہے اور ان کی ترتیب میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اسلام کی دعوت، امت مسلمہ کی منصبی ذمہ داری ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔اس کے لیے قرآن مجید نے جو راہ دکھائی ہے، توقع ہے اس کتاب کے ذریعہ اس کی کسی قدر وضاحت ہوسکے گی۔

راقم کی کتاب **'اسلام کی دعوت'** میں بھی اس کے بعض پہلو زیر بحث آئے ہیں۔ تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے اور اس عاجز کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔

ڈاکٹر محمد رفعت (چیئرمین تصنیفی اکیڈمی و مدیر ماہ نامہ زندگی نو) اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی (سکریٹری تصنیفی اکیڈمی) کا شکر گزار ہوں کہ ان کے مشوروں سے کتاب کو بہتر بنانے میں مدد ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

جلال الدین عمری

۴/ جون ۲۰۱۸

حکیمانہ خطاب کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ کے دین کو انسانوں تک پہنچانا بڑا وسیع ہی نہیں بڑا نازک کام بھی ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ یہ کام حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں 'جدال' یعنی بحث و مباحثہ اور گفتگو کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اس صورت میں 'جدالِ احسن' کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحث اور گفتگو بہتر سے بہتر اور انتہائی شائستہ طریقہ سے ہو۔ جہاں یہ محسوس ہو کہ بات کو سمجھنے اور سمجھانے کا جذبہ نہیں ہے، یا تکرار، کٹ حجتی اور بات کی پچ پائی جاتی ہے، بحث سے اجتناب کیا جائے۔ یہ اصولی اور جامع ہدایات سورۂ نحل کی ایک آیت میں دی گئی ہیں۔ آیت یہ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ○
(النحل:۱۲۵)

اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ۔ اور ان سے مباحثہ کرو اس طریقہ سے جو بہتر ہو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی جانتا ہے۔

دعوت ۔حکمت سے

آیت میں دعوت کے لیے سب سے پہلے حکمت پر زور دیا گیا ہے۔ حکمت علمی اور فکری بھی ہوتی ہے اور عملی بھی[1] دعوت کے لیے یہی حکمت مطلوب ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ کے رسول دونوں طرح کی حکمت سے نوازے جاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب **'تجلیاتِ قرآن'** میں مضمون 'قرآن مجید میں حکمت کا تصور' ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

حکمتِ دعوت کے بہت سے پہلو ہیں۔ بعض پہلوؤں کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جارہی ہے۔

۱۔ مخاطب کا تعین

اللہ تعالیٰ کا دین ساری دنیا کے لیے اور سب انسانوں کے لیے ہے، لیکن اسے پیش کرنے کے لیے مخاطب کا تعین بہت ضروری ہے۔ پہلے آپ کو طے کرنا ہوگا کہ آپ کا خطاب اس کے ماننے والوں سے ہے یا انکار کرنے والوں سے، عوام سے ہے یا خواص سے، جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ہے یا قدیم تعلیم یافتہ حضرات سے، بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ نوجوانوں سے ہے یا سن رسیدہ بزرگوں سے۔ اس کے بعد ہی آپ یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ خطاب کی نوعیت کیا ہو؟ اور کس طرح دین پیش کیا جائے؟ بسا اوقات ہماری تحریروں اور تقریروں میں مخاطب کا تعین نہیں ہوتا۔ جہاں وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے حق میں دلائل کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہم اس کے احکام سنانے لگتے ہیں اور جہاں اس کے احکام کا بتانا کافی ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات پر زور صرف کرنے لگتے ہیں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم اونچے تعلیم یافتہ طبقہ سے خطاب کررہے ہیں، لیکن اچانک ہماری گفتگو عوامی سطح سے شروع ہو جاتی ہے، کبھی خطاب کا رخ بہ ظاہر غیر مسلموں سے ہوتا ہے، لیکن جلد ہی وہ مسلمانوں سے خطاب میں تبدیل ہوجاتا ہے، کبھی دورِ جدید کے نوجوانوں سے اس انداز میں گفتگو ہوتی ہے جیسے پرانی نسل کے بزرگ سامنے بیٹھے ہوں۔ اس طرح ہمارے مخاطب بدلتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ہماری تقریر اور تحریر بھی بھٹکتی رہتی ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت مخاطب کون ہے اور اس کے لیے کون سا طریقۂ دعوت مناسب ہے؟ بے محل گفتگو سے وہ فائدہ نہیں ہوسکتا جو مطلوب ہے۔

۲۔ موقع و محل کی رعایت

حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گفتگو چاہے اسلام کے ماننے والوں سے ہو یا نہ

ماننے والوں سے، مخاطب کے ذہن وفکر کو سامنے رکھ کر کی جائے اور اس کی ذہنی استعداد اور موقع ومحل کا لحاظ رکھا جائے۔ احادیث میں اس کے صاف اشارے موجود ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک طویل حدیث بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر کسی ضرورت سے تشریف لے گئے۔ واپسی میں تاخیر ہوئی تو ہم سب کو تشویش لاحق ہوگئی۔ میں تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ آپ ایک انصاری کے باغ میں موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا: آپ کی تاخیر کی وجہ سے سب لوگ پریشان ہیں، میں بھی اسی پریشانی میں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں۔آپ نے اپنے جوتے مجھے عنایت کیے اور کہا انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ حکم اس لیے دیا، تاکہ آپ کی یہ نشانی دیکھ کر صحابہ کرام کو پورا اطمینان ہو کہ حضرت ابو ہریرہؓ آپ ہی کے پاس سے آ رہے ہیں اور ان کی فکر مندی دور ہو۔ اس کے بعد صحابہ کی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے جواب میں فرمایا:

فمن لقیت من وراء ھٰذا الحائط یشھد ان لاّ الٰہ الا اللہ مستیقناً بھا قلبہ فبشرہ بالجنۃ

اس دیوار کے پیچھے جس سے بھی تمہاری ملاقات ہو اور جو لا الٰہ الا اللہ کی یقین قلب کے ساتھ گواہی دے تو اسے جنت کی خوش خبری سنا دو۔

جب میں آپ کے پاس سے لوٹا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ میں نے آپ کا یہ ارشاد سنایا تو انھوں نے اتنے زور سے میرے سینہ پر ہاتھ مارا کہ میں گر پڑا۔ میں نے نبی ﷺ سے اس کی شکایت کی، آپ نے حضرت عمرؓ سے ان کی اس سختی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کیا آپ نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا:

لا تفعل فانّی اخشی ان یتکل الناس علیھا فخلّھم یعملونَ

ایسا نہ کریں، کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ کلمہ کی شہادت ہی پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔ آپ ان کو چھوڑ دیں، تاکہ وہ عمل کریں۔

حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ بشارت بلاشبہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا مطلق انداز میں ہر شخص کے سامنے پیش کیا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کا غلط مفہوم بھی نکالا جاسکتا ہے اور اس سے قوت عمل بھی متاثر ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہاں اِنھیں عمل کرنے دو[۱]

اسی مفہوم کی ایک اور روایت آتی ہے۔ حضرت معاذؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما من احد یشهد أن لا اله الا الله و أن محمدا رسول الله صدقا من قلبه الا حرمه الله علی النار

جو کوئی اس بات کی صدق دل سے گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ ضرور اس پر جہنم کو حرام کر دے گا۔

حضرت معاذؓ نے خوش ہوکر فرمایا کہ کیوں نہ میں دوسروں کو بھی ان کے ایمان پر جنت کی یہ بشارت سنا دوں؟ آپ نے انھیں منع کرتے ہوئے فرمایا: اذًا یتّکلوا (تب تو وہ اسی پر بھروسہ کرنے لگیں گے)[۲]

یہ بخاری کی روایت ہے۔ مسلم میں یہ روایت کسی قدر تفصیل سے آئی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں لا تبشرهم یتکلوا[۳] (ان کو اس کی بشارت نہ دو، ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے)۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

لا، دعهم، فلیتنافسوا فی الأعمال فإنی أخاف أن یتّکلوا[۴]

یہ خوش خبری انھیں نہ سناؤ، انھیں اعمال خیر میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے دو۔ اس خوش خبری کے سنانے سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اسی پر تکیہ نہ کرنے لگ جائیں۔

۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ

۲۔ بخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم الخ

۳۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ

۴۔ فتح الباری: ۱/۱۶۳

آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ محض اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی شہادت دینا نجات کے لیے کافی ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس بشارت کے اجمال سے یہ شبہ ہوسکتا تھا، اس لیے جب تک اس کی تفصیل سامنے نہ رکھی جائے، اسے بیان کرنے سے منع فرمایا۔

صحابۂ کرام کے ہاں بھی اس قسم کی نصیحت ہمیں ملتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

حدثوا الناس بما یعرفون، أتحبون أن یکذب اللہ ورسولہ [1]

لوگوں کو وہ بات بتاؤ جسے وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب ہو۔

مطلب یہ کہ دین کی جو باتیں کسی شخص کے لیے بالکل نامانوس اور اجنبی ہوں، وہ انہیں قبول تو نہیں کرسکتا، البتہ اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار ہی کر بیٹھے۔ اس لیے وہ باتیں اس کے سامنے رکھنی چاہئیں جو اس کی عقل کی گرفت میں آسکتی ہوں اور جو باتیں اس کی سمجھ سے باہر ہوں ان سے احتراز کرنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لا تبلغہ عقولھم الا کان لبعضھم فتنۃ [2]

جب تم کسی قوم کو ایسی حدیث سناؤ گے جس کی باریکیوں تک اس کی عقل نہ پہنچ سکے تو ان میں سے بعض افراد کے لیے یہ فتنہ بن جائے گی۔

ان احادیث اور آثار کا تعلق اصلاً مسلمانوں سے ہے، لیکن ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ دعوت وتبلیغ ایک حکیمانہ عمل ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں جو مسئلہ چاہے چھیڑ دے اور موقع ومحل کی رعایت کے بغیر بحث شروع کردے۔ اس میں مخاطب کی نفسیات، اس کے ذہنی پس منظر اور ماحول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم الخ

[2] مسلم، مقدمہ، باب النہی عن الحدیث بکل ما سمع

۳۔ اصولِ دین مقدم ہیں

اب آیئے یہ دیکھیں کہ جو لوگ دین کو نہ مانتے ہوں یا اس کے منکر اور مخالف ہوں ان کے سامنے دعوت کس طرح پیش کی جانی چاہیے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کے سامنے پہلے دین کی اصولی اور بنیادی باتیں رکھی جائیں۔ پہلے مرحلے میں تفصیلات سے، جہاں تک ہو سکے، تعرض نہ کیا جائے، اس لیے کہ دین کی تفصیلات کا رشتہ اس کی بنیادی تعلیمات سے جڑا ہوا ہے۔ اگر آدمی دین کی بنیادوں پر مطمئن ہو جائے تو تفصیلات سے انکار نہیں کر سکتا، لیکن اگر ان بنیادوں ہی پر اسے یقین نہ ہو تو تفصیلات پر اسے مطمئن کرنا مشکل ہوگا۔ ایک بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دس باتوں پر اس کا عدم اطمینان باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا یہی اسوہ رہا ہے۔ وہ اپنی مخاطب قوم کو سب سے پہلے توحیدِ خالص کی دعوت دیتے ہیں، ہر طرح کے شرک کی تردید کرتے ہیں، رسالت کی حقیقت اور رسول کی حیثیت واضح کرتے ہیں، آخرت کا صاف ستھرا اور بے آمیز تصور پیش کرتے ہیں اور اخلاقی تعلیمات پر، جن کی قدر و قیمت ہر انسان محسوس کرتا ہے، زور دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ جو لوگ ان باتوں پر ایمان لے آئیں، انھیں دنیا اور آخرت کی کام یابی کی خوش خبری سناتے ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں اس کے بھیانک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ مکہ میں جو لوگ دین سے بے خبر تھے اور جنھیں اس کی صداقت پر یقین نہیں تھا، بلکہ جو اس کے مخالف اور دشمن تھے، انھیں آپ نے اصولِ دین ہی کی دعوت دی، ان کے حق میں مضبوط دلائل فراہم کیے اور ان کی توضیح و تشریح میں پوری توانائی صرف کی۔ لیکن شریعت کی تفصیلات نہیں بیان کیں، اس لیے کہ شریعت کی ضرورت اصلاً اس کے ماننے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدینہ میں، بلکہ مکہ میں بھی جب کبھی یہ ضرورت پیش آئی، تفصیلات فراہم کی گئیں۔

حدیث سے بھی یہی حکمتِ تبلیغ سامنے آتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ شام گئے ہوئے تھے۔ ہرقل نے وہاں ان سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں بعض سوالات کیے۔ ان میں سے ایک سوال آپ کی تعلیمات سے متعلق تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو کن باتوں کی تعلیم دیتے ہیں؟ حضرت ابو سفیانؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن آپ کی تعلیمات سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے آپ کی تعلیم کا خلاصہ اس طرح بیان کیا۔

یقول اعبدوا اللہ وحدہ ولا تشرکوا بہ شیئا و اترکوا ما یقول اٰباؤکم، و یأمرنا بالصلوۃ و الصدق و العفاف و الصلۃ [1]

وہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور تمہارے باپ دادا جو کچھ اس معاملہ میں کہتے تھے اسے چھوڑ دو۔ وہ ہمیں حکم دیتے ہیں نماز کا، صداقت اور راستی کا، عفت اور پاک دامنی کا اور صلہ رحمی کا۔

اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کن بنیادی نکات پر مرکوز تھی؟ اور کن باتوں پر آپ زور دیا کرتے تھے؟

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے گورنر کی حیثیت سے یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی:

انك ستأتي قوما أهل كتاب فاذا جئتهم فادعهم الى أن يشهدوا أن لا اله الا الله و أن محمدًا رسول الله، فان هم اطاعوا لك بذلك فاخبرهم ان الله قد فرض عليهم خمس صلوات في كل يوم و ليلة، فان هم أطاعوا لك بذلك فاخبرهم أن الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ عن أغنيائهم فترد على فقرائهم [2]

تم عن قریب ایسی قوم کے پاس جاؤ گے جو اہل کتاب ہے۔ جب ان کے پاس پہنچو تو انھیں دعوت دو کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیں۔ اگر وہ تمھاری یہ بات مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پانچ نمازیں ہر دن اور رات میں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بات بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو لوٹا دی جائے گی۔

---

[1] بخاری، کیف کان بدء الوحی

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین الخ

یمن میں اس وقت اہل کتاب ہی نہیں مشرک بھی تھے۔ آپ نے اہل کتاب کا خاص طور پر غالباً اس لیے ذکر فرمایا کہ وہ آسمانی کتابوں کے ماننے والے اور پڑھے لکھے تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان سے خطاب کا طریقہ بھی مشرک قوموں سے خطاب کے طریقہ سے مختلف ہونا چاہیے تھا۔ یہ گویا مخاطب کے مزاج کو پہلے سے ذہن میں رکھنے اور اس کی رعایت سے مناسب انداز اختیار کرنے کی ہدایت تھی۔

اس حدیث سے یہ راہ نمائی بھی ملتی ہے کہ داعی کے ذہن میں تو دین پورا کا پورا ہوگا، لیکن اسے وہ ایک ترتیب سے پیش کرے گا۔ اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

فلیکن أول ما تدعوهم الیه عبادة الله عزو جل فاذا عرفوا الله عزوجل فأخبرهم ..... [1]

پہلی چیز جس کی تم ان کو دعوت دوگے وہ اللہ عزوجل کی عبادت ہوگی۔ جب وہ اللہ عزوجل کو پہچان لیں تو انہیں بتاؤ.....

مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دو۔ اللہ کا وہ تصور جو اسلام پیش کرتا ہے، جب ان کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے اور وہ یہ تسلیم کرلیں کہ اسی کی عبادت ہونی چاہیے تو پھر شریعت کی تفصیلات ان کے سامنے رکھو۔ لیکن وہ بھی سب کی سب اور ایک ساتھ نہیں، بلکہ اس میں بھی ایک ترتیب ہونی چاہیے۔ یہ ترتیب احکامِ شریعت کی اہمیت کے لحاظ سے ہوگی جو حکم جتنا اہم ہوگا اتنا ہی اسے مقدم رکھا جائے گا، جس حکم کی اہمیت نسبتاً کم ہوگی اس کا مقام بھی دعوت میں اسی لحاظ سے متعین ہوگا۔

یہاں ابھرنے والے ایک سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اب دین مکمل ہوچکا ہے۔ اس کے اصول وفروع سب کے سامنے ہیں۔ غیر مسلموں سے گفتگو میں اصولِ دین ہی نہیں، فروعِ دین بھی زیر بحث آسکتی ہیں۔ کیا ان کا جواب نہ دیا جائے اور ان پر گفتگو سے احتراز کیا جائے؟

اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ جہاں اس طرح کا کوئی سوال پیدا ہو اس کا

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین الخ

جواب فراہم کرنا عین تقاضائے دعوت ہے۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ انھوں نے وقتِ ضرورت دین کی تفصیلات سے بحث کی ہے اور جو سوالات اٹھے ان کا جواب دیا ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال ذہن میں رہنی چاہیے کہ احکامِ شریعت اصولِ دین سے مربوط ہیں، اس لیے توجہ اصلاً اصول دین ہی پر مرکوز ہونی چاہیے اور مخاطب کو پہلے ان ہی پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۴۔ طرزِ خطاب میں ملاطفت

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب تک بات سختی کے ساتھ نہ کی جائے اور مخاطب کو چوٹ نہ لگے، دعوت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ بلاشبہ ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں سختی کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ڈنکے کی چوٹ پر حق کا اظہار کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ بات ہمیشہ داعی کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اندازِ گفتگو مہذب اور شائستہ ہو۔ محض اس کے غلط اندازِ تخاطب کی وجہ سے مخاطب کے اندر دعوت ہی کے خلاف نفرت اور بے زاری کے جذبات نہ بھڑک اٹھیں۔ خطاب کی درشتی سے بالعموم مخاطب کی اَنا مجروح ہوتی اور اس کے پندار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ داعی کو اپنا حریف سمجھتا اور دعوت کی مخالفت کو اپنا فرض تصور کرنے لگتا ہے۔ اس لیے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مخاطب کو متنفر کرنے والا انداز نہ اختیار کیا جائے کہ مخاطب بجائے اس کے کہ دعوت میں دل چسپی اور کشش محسوس کرے اس سے دور بھاگنے لگے۔ داعی کے خطاب میں بالعموم نرمی اور ملاطفت ہونی چاہیے۔ یہ نرمی کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں، بلکہ مخاطب کو قریب کرنے کے لیے ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تو ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ اندازِ خطاب میں نرمی ہو۔ ارشاد ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○

تم دونوں جاؤ فرعون کے پاس۔ بے شک اس نے سرکشی کی ہے۔ اس سے نرمی سے بات کرو۔ شاید وہ

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ○ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ○ (طٰہٰ: ۴۳-۴۶)

نصیحت حاصل کرے یا اللہ کی نافرمانی سے ڈرے۔ دونوں نے عرض کیا۔ اے ہمارے رب ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ زیادتی کرے گا یا اس کی سرکشی اور بڑھ جائے گی۔ اللہ نے فرمایا تم خوف مت کھاؤ۔ بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق کا اظہار و اعلان بہرحال ہوگا، فرعون جیسی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ہوگا اور بے خوف و خطر ہوگا، لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے گا کہ ہمارے لب و لہجہ کی تلخی اور غلط اندازِ گفتگو مخاطب کو حق سے دور نہ کرے اور اس کے دل کے دروازے کھلنے کی جگہ بند نہ ہوجائیں۔ بعض اوقات پہاڑ جیسی صداقت بھی محض ناپسندیدہ طرزِ خطاب کی وجہ سے رد کر دی جاتی ہے اور کبھی تلخ سے تلخ حقیقت کو بھی شیریں کلامی قابل قبول بنا دیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو 'قول لیّن' کی جو نصیحت کی گئی تھی اس کے ذیل میں حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ''اس میں بڑی عبرت اور نصیحت ہے۔ وہ یہ کہ فرعون سرکشی اور نافرمانی کی آخری حد کو پہنچا ہوا تھا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مخلص اور منتخب بندے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کو حکم دیا کہ وہ فرعون سے نرمی اور ملاطفت کے ساتھ بات کریں۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو طرزِ خطاب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس سے متعلق سلف کے بعض اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بات میں نرمی اور محبت ہو، تاکہ نفس پر اس کا گہرا اثر پڑے۔[1]

حضرت موسیٰؑ کو فرعون سے جس طرح خطاب کا حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر دوسرے مقام پر اس طرح آیا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ○ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ○ (النّٰزعٰت: ۱۷-۱۹)

جاؤ فرعون کے پاس، اس نے سرکشی کی ہے۔ اس سے کہو: کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ سنور جائے اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں تاکہ تو اس سے ڈرے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۵/ ۳۰۳

اس میں فرعون کی سرکشی پر تنقید بھی ہے اور اصلاح حال کی دعوت بھی۔ لیکن دونوں باتوں میں نصیحت اور خیر خواہی کا پہلو غالب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ اس کی فلاح و کام یابی کے لیے بے چین ہیں۔ دعوت میں یہی اندازِ خطاب مطلوب ہے۔

۵۔ انذار اور تبشیر

دعوت در اصل انذار اور تبشیر کا عمل ہے۔ 'انذار' کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے دین کے انکار کے نتائج سے آگاہ کرنا۔ 'تبشیر' اس حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنانے ہی سے انسان دنیا اور آخرت کی فلاح سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ دعوت کے لیے انذار اور تبشیر دونوں ہی ضروری ہیں۔ اس میں انسان کی فطرت کی خاص رعایت بھی ہے۔ انسان جس نظریہ اور عقیدہ کو اختیار کرلیتا ہے اس سے ایک طرح کی ذہنی اور جذباتی وابستگی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ وابستگی بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ بسا اوقات انسان کے نزدیک اس کی صداقت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ اسی وقت اس سے دست بردار ہوسکتا ہے جب کہ ایک طرف علمی تنقید کے ذریعہ اس کی فکری کم زوریوں کی نشان دہی کی جائے اور دوسری طرف اس کے متبادل فکر کی برتری اور معنویت بھی واضح کی جائے۔ یہی انذار و تبشیر ہے۔ یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے رسول اختیار کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی پوری دعوت انذار و تبشیر پر مبنی ہوتی ہے۔[1]

انذار و تبشیر کے دو پہلو ہیں: ایک کا تعلق آخرت سے ہے اور دوسرے کا ہماری اس دنیا سے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت میں یہ دونوں پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ

---

[1] انذار و تبشیر کا فریضہ صرف وعظ و نصیحت ہی کے ذریعہ نہیں، بلکہ خالص علمی اور عقلی انداز میں بھی انجام دیا جاتا ہے۔ اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب **'عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے'** ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

ایک طرف یہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے یا رد کرنے کا آخرت میں کیا انجام سامنے آئے گا؟ اور دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ دنیا میں اس کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں؟ قرآن مجید نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ ذیل میں اسی کے الفاظ میں آخرت میں نیک و بد کے انجام کا ذکر کیا جا رہا ہے:

هٰذَا ذِكْرٌ ۭ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ○ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ○ مُتَّكِـــِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ○ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ○ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ○ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ○ هٰذَا ۭ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ○ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ○ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ○ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۭ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ○ (ص:۴۹-۵۹)

یہ ایک ذکر ہے اور بے شک متقیوں کے لیے بہترین ٹھکانا ہے۔ ہمیشہ رہنے والے باغات، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوئے بہت سے میوے اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس نگاہیں نیچی رکھنے والی اور ہم سن بیویاں ہوں گی۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن کے حساب کے دن دیے جانے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ بے شک یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ تو متقیوں کا انجام ہے اور سرکشوں کے لیے بہت برا ٹھکانا ہے، یعنی جہنم جس میں وہ جائیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے۔ یہ اسے چکھیں گے اور کچھ اسی طرح کی اور چیزیں بھی ہوں گی۔ لو یہ ایک اور لشکر ہے جو تمہارے ساتھ گھسا چلا آ رہا ہے۔ ان کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے۔ یہ بھی جہنم میں داخل ہونے والے ہیں۔

آخرت کے انجام کی یہ تصویر ہمیں قرآن مجید کے صفحات میں جا بہ جا ملتی ہے[1]۔ جنت کی تصویر اتنی پُرکشش ہے کہ اگر آدمی بے حسی کا شکار نہ ہو تو دنیا اپنی ساری رعنائیاں کھو بیٹھتی ہے اور آدمی اس کی طرف بے اختیار پیش قدمی چاہتا ہے۔ قرآن جہنم کا اتنا ہول ناک نقشہ پیش کرتا ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل اس سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔

---

[1] مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ، سورۂ نبا اور سورۂ غاشیہ وغیرہ

اللہ تعالیٰ کے رسول جہاں یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے سے آخرت میں انسان جنت کا سزاوار ہوگا اور اس کے انکار کا نتیجہ جہنم کی شکل میں ظاہر ہوگا، وہیں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اس دین کے انکار سے دنیا میں بھی خدا کا عذاب آئے گا اور انکار کرنے والے تباہ کر دیے جائیں گے۔ قرآن مجید نے تاریخ کے حوالے سے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ○ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ○ (النحل:۲۶-۲۷)

ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اللہ کے دین کے خلاف سازش کی۔ اللہ نے ان کی سازش کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت ان پر گر پڑی اور ان پر عذاب اس طرف سے آیا جس کی ان کو خبر بھی نہ تھی۔ پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور کہے گا: کہاں ہیں میرے شریک جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے؟ اس وقت علم والے کہیں گے: بے شک آج کافروں کے لیے عذاب اور رسوائی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں بعض نافرمان قوموں پر دنیا میں جو عذاب آیا اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ○ (العنکبوت:۴۰)

پھر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑا۔ ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی اور کسی کو خوف ناک آواز نے آدبوچا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

۶۔ دنیا اور آخرت کی فلاح

یہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کے انکار کا دنیاوی انجام ہے اور اس کے قبول کرنے کا

اس دنیا میں جو ثمرہ ملے گا اسے بھی اللہ کے رسول نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے، وہ یہ کہ یہ دنیا، اس کا مال و اسباب اور اس کا عیش اور راحت آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہے، اس کا کوئی وزن نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جو ظلم و زیادتی اور فتنہ و فساد سے پاک ہو، جہاں وہ امن و سکون سے زندگی گزار سکے اور اس کی ضروریات معقول طریقے سے پوری ہو رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ایک طرف دنیا کی بے ثباتی واضح کرتے ہیں، تاکہ آخرت کی طرف سے توجہ نہ ہٹنے پائے اور دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ اللہ کے دین کو جب کوئی قوم قبول کرتی ہے تو اس کی مہلتِ حیات بڑھا دی جاتی ہے، اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اسے پاکیزہ زندگی ملتی ہے اور اس پر چاروں طرف سے بارانِ رحمت برسنے لگتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر قرآن نے ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (نوح:۲-۴)

نوحؑ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ (اور یہ بتاتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور ایک وقت مقرر تک تمہیں مہلت دے گا۔ بے شک اللہ کا طے کیا ہوا وقت جب آجائے تو اسے ٹالا نہیں جاسکتا۔ کاش تم اس بات کو جانتے۔

اپنی دعوت کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ○ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ○ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ○ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ○ (نوح:۱۰-۱۳)

تو میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کردے گا۔ تمہیں کیا ہوگیا کہ تم اللہ سے وقار اور عظمت کی توقع نہیں رکھتے۔

حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ○ (ھود:۵۲)

اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ آسمان سے تم پر خوب بارش برسائے گا اور تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اور مجرم بن کر روگردانی نہ کرو۔

اسی کا اعلان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی ہوا:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ○ وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ○ (ھود:۲-۳)

عبادت نہ کرو تم مگر صرف اللہ کی۔ بے شک میں تمہارے لیے اس کی طرف سے ڈرانے والا اور بشارت سنانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم کو ایک وقت مقرر تک اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ اور اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں ڈرتا ہوں تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب سے۔

ان آیات میں انذار و تبشیر کے دونوں پہلو ایک ساتھ نمایاں ہیں۔ یہی انداز اہلِ کتاب سے خطاب کرتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے:

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ○ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ○ (المائدۃ:۶۵-۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کی غلطیوں کو ضرور معاف کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں ضرور داخل کرتے۔ اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور اس کتاب کو جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔ (ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نزول ہوتا) ان میں سے کچھ لوگ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں لیکن ان کی اکثریت وہ ہے جو برا عمل کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے کہ جو قوم اس کے دین کو سچے دل سے قبول کرے گی اور اس پر پوری طرح کاربند ہوگی وہ اسے اس دنیا میں سیاسی اقتدار اور دوسری قوموں کے مقابلے میں برتری بھی عطا فرمائے گا۔ ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (النور:۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور ان کے اس دین کو، جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، ان کے لیے جما دے گا اور ان کے خوف کو ضرور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس کے بعد جو ناشکری کرے گا وہی نافرمان ہوگا۔

سورۂ صف میں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کا صلہ جو دنیا اور آخرت میں ملنے والا ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصّف:۱۲، ۱۳)

وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں رکھے گا جو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کام یابی ہے۔ اور وہ دوسری چیز، جو تم چاہتے ہو، وہ بھی تمہیں عطا کرے گا، یعنی اللہ کی نصرت اور قریب میں حاصل ہونے والی فتح۔ تم مومنوں کو خوش خبری سنا دو۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین کا تعلق دنیا کی فلاح سے بھی ہے اور آخرت کی فلاح سے بھی۔[1] یہی وہ پہلو ہے جسے دعوتِ دین کی راہ میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

---

[1] 'تجلیات قرآن' میں بھی اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ طبع دوم ص ۱۷۸-۱۸۲

دعوت دین میں اگر صرف آخرت کی فلاح اور کام یابی کا ذکر کیا جائے اور یہ بالکل معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں ہماری اس دنیا کے دکھ درد کا بھی علاج ہے، وہ یہاں کے مسائل بھی حل کرتا ہے اور اس سے پاکیزہ زندگی ملتی ہے، تو اس سے فطری طور پر یہ تاثر پیدا ہوگا کہ دین کا تعلق ہماری اس دنیا کے امور و مسائل سے نہیں ہے۔ اسی طرح دعوت میں اگر دنیا کی کام یابی کا پہلو اس قدر حاوی ہو کہ فلاحِ آخرت کا تصور دب جائے تو لازماً یہ تصور ابھرے گا کہ اللہ تعالیٰ کا دین دنیا کے مسائل حل کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کے ذریعے آخرت کی کام یابی ایک ضمنی چیز ہے۔ ان دونوں تصورات میں ایک طرح کا عدم توازن ہے۔ اس کی وجہ سے دین کا تصور ہی بگڑ سکتا ہے۔ اس سے احتیاط کی ضرورت ہے۔

۷۔ دین کا برحق ہونا دلائل سے ثابت کیا جائے

حکمت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو محض دعویٰ کی شکل میں نہ پیش کیا جائے، بلکہ اس کے حق میں معقول دلائل فراہم کیے جائیں اور مخاطب کے ذہن و قلب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ دعوت اس طرح دی جائے کہ اللہ کا دین وقت کے افکار کے مقابلے میں کم تر یا بے وزن نہ محسوس ہو، بلکہ اس کی حیثیت ایک ارفع و اعلیٰ نظامِ فکر کی ہو۔ اس کے مقابلے میں غیر علمی اور جذباتی رویہ تو اختیار کیا جاسکے، دلائل کے ذریعے اس کی تردید ممکن نہ ہو۔ اللہ کے دین کو یہ مقام اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ اس کی پشت پر دلائل کی زبردست قوت موجود ہو اور اسے اپنے وقت کے ایک بلند تر فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

قرآن مجید نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے دین کو علم اور عقل کی بنیاد پر ثابت کیا۔ وہ اس چیلنج کے ساتھ میدان میں آیا کہ حیات و کائنات کے بارے میں وہی تصور صحیح اور برحق ہے جسے وہ پیش کر رہا ہے۔ اس کے سوا ہر نظریہ غلط اور باطل ہے۔ اس نے اپنے موقف کے حق میں اتنے مضبوط دلائل فراہم کیے کہ اس کی

تردید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی وجہ سے مخالف افکار کے قدم اکھڑ گئے اور اسلام کے لیے انھیں میدان خالی کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول جو مختلف زمانوں میں آتے رہے، انھوں نے بھی اپنی قوم کو دلائل کے ذریعے ہی اللہ کے دین پر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے دلائل اتنے مضبوط ہوتے تھے کہ مخالفین دل سے ان کی برتری ماننے پر مجبور ہوتے تھے، چاہے ان کی زبانیں اس کا اقرار نہ کرتی ہوں۔

قرآن مجید نے جن پیغمبروں کے حالات بیان کیے ہیں، ان میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی دعوتی سرگزشت زیادہ تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس سے ان کی دعوت کا انداز، ان کی حکمت و تدبیر اور ان کے دلائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت، ان کے دلائل اور اس راہ میں ان کی قربانیوں کی کسی قدر تفصیل راقم نے اپنے مجموعۂ مضامین **'راہیں کھلتی ہیں'**[1] میں پیش کی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کے بعض دلائل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو منصب رسالت پر سرفراز کرنے کے بعد حکم ہوا کہ فرعون نے اللہ سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی ہے، اسے اللہ کی طرف بلاؤ اور یہ حقیقت اس پر واضح کردو کہ اس کے لیے امن اور سلامتی کی راہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو مان کر اپنی اصلاح اور تزکیہ کرلے، ورنہ وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔

حضرت موسیٰؑ نے (ان کے ساتھ ان کی معاونت کے لیے ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی تھے) یہ باتیں ظاہر ہے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ رکھی ہوں گی، لیکن فرعون کے لیے یہ باتیں اتنی تلخ تھیں اور اس کے پندار پر ان سے اتنی زبردست چوٹ پڑ رہی تھی کہ اس پر ان کا شدید ردعمل ہوا۔ اس نے جھنجلا کر سوال کیا:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (طٰہٰ:۴۹) اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟

اسی دعوت کے ذیل میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

---

[1] ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

فَحَشَرَ فَنَادٰی○ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی○ (النّٰزعٰت: ۲۳-۲۴) اس نے لوگوں کو جمع کیا اور آواز لگائی کہ میں تمہارا ربِّ اعلیٰ ہوں۔

حضرت موسیٰؑ سے اس سوال کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ ملکِ مصر کا رب تو میں ہوں آخر تمہارا وہ رب کون ہے جس کا پیغام پہنچانے تم میرے پاس آئے ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے بہت ہی ٹھنڈے انداز میں جواب دیا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی○ (طٰہٰ: ۵۰) اس نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور اسے راستہ دکھایا۔

حضرت موسیٰؑ نے رب کی دو نمایاں صفات بیان کیں: ایک یہ کہ وہ اس کائنات کا خالق ہے۔ اسی نے ہر شی کو مناسب وجود بخشا ہے، پھر یہ کہ اس نے کسی بھی چیز کو پیدا ہی نہیں کیا، بلکہ اسے ہدایت بھی دی ہے۔ اس نے ایک ایک چیز کی صورت گری کی، مناسب جسمانی ساخت عطا کی اور اس کی جبلّت میں یہ بات رکھ دی کہ اسے اس دنیا میں کس طرح زندگی گزارنی ہے۔ خشکی اور تری کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق اسی ہدایت کی پابند ہے۔ اسی سے اس کی زندگی قائم ہے۔ خلق اور ہدایت دونوں میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جس خدا نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس کی ہر مخلوق کو ہدایت سے بھی نوازا ہے، کیا وہ انسان کی ہدایت کا انتظام نہیں کرے گا اور اسے یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا؟ یہ بات ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے اس وقت بھی ہدایت کا انتظام کیا ہے اور یہی ہدایت میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

آدمی جب حق کو قبول کرنا نہیں چاہتا تو عقل کی جگہ جذبات کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ فرعون نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے پوچھا:

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (طٰہٰ: ۵۱) جو نسلیں پہلے گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟

یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہدایت فرماتا ہے اور نجات اسی کو ملے گی جو اس ہدایت کے مطابق عمل کرے، تو بتاؤ کہ جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں

ان کا کیا حشر ہوگا؟ کیا وہ سب گم راہ تھے، کیا وہ سب جہنم میں جائیں گے؟

اس سوال کے ذریعے وہ حضرت موسیٰؑ کو ایک جذباتی مسئلہ میں الجھا کر اپنی قوم اور درباریوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے بڑے حکیمانہ طریقہ سے اس کا جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ○ — اس کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ تو غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ (طٰہٰ:۵۲)

مطلب یہ کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرے گا، اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میں غیب کے حالات سے باخبر ہوں۔ البتہ اتنی بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں ان کے تمام اعمال کا ریکارڈ اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہے، کسی کی کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اس سے نہ تو کسی غلطی کا صدور ممکن ہے اور نہ نسیان اور فراموشی اسے لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے علم کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔

یہ سورۂ طٰہٰ کی آیات ہیں۔ اس سلسلے کی بعض تفصیلات سورۂ شعراء میں بھی ملتی ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء:۲۳) — فرعون نے کہا: اور یہ رب العالمین کیا ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انتہائی سنجیدگی اور متانت اور پوری بے خوفی کے ساتھ جواب دیا:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ (الشعراء:۲۴) — آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب چیزوں کا رب جو ان کے درمیان میں ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

یعنی رب العالمین وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو وجود دیا اور جو انھیں ایک

خاص نظام کے تحت چلا رہا ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک یہاں کی ہر چیز اس کی پابند ہے۔ یہ اس کی سراسر رحمت ہے کہ وہ اس نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کی رحمت کے مظاہر پورے کائنات میں ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کی رحمت اور نگرانی نہ ہوتو یہ زمین و آسمان باہم ٹکرا کر ختم ہوجائیں۔

اس دلیل کا فرعون کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خود زمین و آسمان کا رب ہے اور ان کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس نے آپ کا مذاق اڑانا چاہا، گویا کہ آپ نعوذ باللہ، غیر دانش مندانہ بات کر رہے ہیں:

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (الشعراء:۲۵) اس نے اپنے درباریوں سے کہا: سنتے ہو؟

حضرت موسیٰؑ نے اس مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے دعویٰ کی وضاحت کے لیے زیادہ قریب کی مثال پیش کی۔ فرمایا:

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ○ (الشعراء:۲۶) تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباء و اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔

مطلب یہ کہ اس کائنات ہی کا نہیں، بلکہ خود تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا وجود بھی اسی کی ربوبیت کا مظہر ہے۔ وہی ہے جس نے تمہیں حیات بخشی۔ وہی تمہاری پرورش کرتا ہے، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزارتا ہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔

فرعون بے دلیل ہوتا چلا گیا، اعتراف شکست کی جگہ بد زبانی کا مظاہرہ کرنے لگا:

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ○ (الشعراء:۲۷) اس نے کہا: بے شک تمہارا یہ رسول، جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے، بالکل ہی پاگل ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اس بدزبانی کا کوئی نوٹس نہیں لیا، بلکہ اپنی دلیل کی مزید وضاحت کی:

قَالَ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَمَا بَيۡنَهُمَاؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۝ (الشعراء:۲۸)

کہا: مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل سے کام لو۔

یعنی رب وہ ہے جس کے قبضہ میں مشرق و مغرب اور پورا نظام شمسی ہے اور یہ سورج اور چاند جس کے حکم کے پابند ہیں۔ یہ فرعون کے اس دعویٰ کی بھی تردید تھی کہ وہ سورج دیوتا کا اوتار ہے۔ مطلب یہ کہ سورج کو بھی رب کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی کی اطاعت کر رہا ہے۔ رب وہ ہے جس کا حکم پوری کائنات پر چل رہا ہے۔

فرعون غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے دھمکی دی:

لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰهًا غَيۡرِىۡ لَاَجۡعَلَنَّكَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِيۡنَ۝ (الشعراء:۲۹)

اگر تم نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

یہ گویا فرعون کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے دلائل سے شکست کھا چکا ہے۔ اب وہ ان کا مقابلہ طاقت سے کرے گا اور حضرت موسیٰؑ کو جیل کی چہار دیواری میں بند کر کے ان کی صدائے حق کو بلند ہونے نہ دے گا۔

اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول دلائل کی کتنی زبردست قوت سے مخالف افکار پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ مخالفین کو اس طرح بے دلیل کر دیتے ہیں کہ انھیں اپنے موقف پر جمے رہنے کے لیے کوئی جواز باقی نہیں رہتا اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ ذاتی مفادات کے لیے لڑ رہے ہیں اور طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

دعوت مستحکم دلائل کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مخاطب کے لیے آسانی سے قابل قبول ہوگی اور نہ اس پر حجت تمام کی جا سکے گی۔

۸۔ مخاطب کی آمادگی

دعوت میں مخاطب کی آمادگی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اگر مخاطب ذہنی طور پر بات سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے تو اس وقت اس سے بات کرنا بے سود ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ اگر کسی مجلس میں دعوت تمسخر اور استہزا کا موضوع بن جائے اور لوگ سنجیدگی کا دامن چھوڑ چکے ہوں تو داعی کو ان سے الجھنے کی جگہ اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیے اور گفتگو کے لیے مناسب موقع تلاش کرنا چاہیے:

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ○ وَ مَا عَلَى الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ○ (الانعام:۶۸،۶۹)

جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیتوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔ اور اگر شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔ اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں ان پر ان کافروں کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری نہیں ہے، البتہ ان کے ذمہ نصیحت کرنا ہے، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

اس ہدایت کی یاد دہانی ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعَاۙ○ (النساء:۱۴۰)

اللہ تعالیٰ اس کتاب میں پہلے بھی یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں، ورنہ تم بھی انہی کی طرح ہوگے۔ بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو ایک ساتھ جہنم میں داخل کرنے والا ہے۔

ان آیات میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین کے مخالف ہیں، یا اس کا

استہزا کرتے ہیں، انھیں سرے سے دعوت ہی نہ دی جائے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت ان کے اندر استہزا کی کیفیت ہو اور وہ دین کے بارے میں سنجیدگی سے سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ نہ ہوں، اس وقت گفتگو سے احتراز کیا جائے، لیکن جب مخاطب کے اندر آمادگی محسوس ہو تو داعی کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایک ہوشیار کسان وہ موقع کبھی نہیں کھوئے گا جب زمین کاشت کے لیے تیار ہو اور اس میں تخم ریزی کی جاسکے۔ اس کی ایک عمدہ مثال ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ملتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کو جب قید خانہ میں رکھا گیا تو ان کے ساتھ دو نوجوان بھی کسی جرم میں گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت و کردار کو دیکھ کر ان کے اندر یہ حسنِ ظن پیدا ہوگیا کہ وہ ایک نیک آدمی ہیں۔ اسی اثنا میں وہ خواب دیکھتے ہیں اور ان کی تعبیر ان سے پوچھتے ہیں، ان کے اس رجحان سے فائدہ اٹھا کر حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ○ (یوسف:۳۷)

جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتادوں گا۔

اسی ذیل میں توحید اور سلسلۂ رسالت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں، جیسے بات میں سے بات فطری طور پر نکلتی چلی آئی ہو:

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ (یوسف:۳۷-۳۸)

یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اور میں نے پیروی کی ہے اپنے باپ دادا ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور سارے انسانوں پر بھی، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

پھر اس کے بعد توحید کا درس دیتے ہیں اور اس کے حق میں بہت ہی مؤثر دلائل فراہم کرتے ہیں:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ○ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ○

(یوسف:۳۹،۴۰)

اے قید کے ساتھیو! بتاؤ، کیا بہت سے متفرق خدا بہتر ہیں یا اللہ جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے؟ اسے چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ فرماں روائی نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا سچا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ در اصل مخاطب کی آمادگی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کی گفتگو کتنی جامع ہوتی ہے اور وہ مخاطب کو مطمئن کرنے کی کتنی سعی بلیغ کرتے ہیں۔

موعظہ حسنہ

قرآن مجید نے دعوت و تبلیغ میں 'موعظہ حسنہ' سے بھی کام لینے کا حکم دیا ہے۔ وعظ یا موعظت یہ ہے کہ انسان کے پاکیزہ جذبات کو ابھارا جائے، غلط روی پر اسے تنبیہ کی جائے اور صحیح روش پر اس کی تحسین ہو۔ ثواب و عقاب کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ دل میں رقّت پیدا ہو اور آدمی خیر کی طرف پیش قدمی کرے اور شر سے باز رہے۔[1]

قرآن مجید نے دعوت کے لیے وعظ کا یہ طریقہ کثرت سے استعمال کیا ہے۔ وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑتا اور اس کے باطن سے اپیل کرتا ہے۔ حق کے انکار پر اس کی سرزنش اور حق کے قبول کرنے پر اس کی تحسین کرتا ہے۔ یہ بات بار بار واضح کرتا ہے کہ اس دنیا کا سود و زیاں چند روزہ اور بے حقیقت اور آخرت کا نفع و نقصان ابدی ہے، اس لیے اس دنیائے ناپائے دار کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا انسان کی بہت بڑی نادانی ہے۔ یہ باتیں اس نے اتنے مؤثر طریقہ سے پیش کی ہیں کہ بڑے بڑے مخالفین کے دلوں کی دنیا بدل گئی ہے۔

قرآن مجید نے حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا حکم دیا ہے۔ امام رازیؒ ان دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہیں کہ حکمت یہ ہے کہ اسلام نے جو

---

[1] امام راغبؒ فرماتے ہیں: الوعظ، زجر مقترن بالتخویف۔ مفردات القرآن مادہ وعظ۔ لسان العرب میں ہے: الوعظ النصح والتذکیر بالعواقب۔ مادہ وعظ۔ اس کی مزید تعریفات آگے آرہی ہیں۔

عقائد اور ایمانیات پیش کیے ہیں انھیں قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت کیا جائے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہے جو اعلیٰ ذہنی استعداد کے مالک ہیں، لیکن جو لوگ نسبتاً کم تر ذہنی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے موعظہ حسنہ ہے۔[1]

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ موعظہ حسنہ ذہین طبقہ کے لیے بالکل بے سود ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ بعض اوقات عام افراد ہی نہیں، بڑے بڑے دانش ور اور فلسفی بھی موعظہ حسنہ کا گہرا اثر قبول کرتے دیکھے گئے ہیں اور اس کے ذریعے فکر کو نیا رخ اور عمل کو نیا میدان ملا ہے۔

موعظت ان لوگوں کے لیے بھی مفید ہے جو دین سے بے خبر یا اس کے مخالف اور منکر ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کو سارے انسانوں کے لیے موعظت اور شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ یعنی دل کے تمام امراض کے لیے نسخۂ شفا کہا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (یونس: ۵۷، ۵۸)

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس موعظت (نصیحت) اور دلوں کی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا آچکا ہے۔ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اے نبیؐ! کہہ دو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ اس پر خوشی منانی چاہیے۔ یہ اس چیز سے بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں اس کا خوف ہوتا ہے، ان کے لیے اس موعظت سے انتہائی فائدہ پہنچتا ہے۔ پورا قرآن ان کے لیے موعظت ہی موعظت ہے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۸)

یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور اس میں ہدایت اور موعظت ہے متقیوں کے لیے۔

---

[1] رازی، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) ۵/ ۳۷۴

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر احکامِ شریعت بیان کرنے کے بعد اس بات کی نصیحت اور تاکید کی ہے کہ ان کی پابندی کی جائے۔ اسی کو وہ موعظت سے تعبیر کرتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں نکاح و طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے نصیحت (موعظت) کی گئی:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ:۲۳۱)

یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور جو کتاب وحکمت اس نے نازل کی ہے اس کے ذریعہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں یہی وعظ یا موعظت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۳۲)

اس کی نصیحت تم میں سے ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو کہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ یہی تمہارے لیے صاف ستھرا اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

احکامِ طلاق کے ذیل میں وعظ کا یہی انداز ایک دوسرے موقع پر بھی اختیار کیا گیا ہے:

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ○ (الطلاق:۲،۳)

ان باتوں کی ہر اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کردے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

سود کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○ (البقرۃ:۲۷۵)

جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا لے چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ لیکن جو شخص اس نصیحت کے آنے کے بعد بھی یہی حرکت کرے تو ایسے لوگ جہنم میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اسی سلسلۂ بیان کے آخر میں ارشاد ہوا:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ○ (البقرہ:۲۸۱)

ڈرو اس دن سے جن دن تم لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

موعظت کا صحیح طریقہ

ان آیات میں احکام شریعت کی پابندی کی جس طرح ترغیب دی گئی ہے اور اس کی جس انداز میں تاکید کی گئی ہے اسے 'وعظ' اور 'موعظت' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں چند باتوں پر زور دیا گیا ہے: ایک تو یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا رہے۔ یہ بات ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک دن اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ کر اپنے ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ کام یاب وہ ہے جو اس دن کام یاب قرار پائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جو ہدایات دی ہیں ان کی پابندی میں خود اس کا فائدہ ہے، اس سے اس کا تزکیہ ہوتا اور اس کے اخلاق و کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں اللہ کے بھروسے پر برداشت کرنا چاہیے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر صحیح معنی میں توکل کرتا ہے وہ غیب سے اس کی مشکلات حل کرتا ہے۔

اس طرح ان آیات میں موعظت کا صحیح طریقہ بتا دیا گیا ہے۔ جب تک اس کی رعایت نہ ہو، کم سے کم یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موعظت مکمل نہیں ہوگی اور اس کا

حق ادا نہیں ہوگا۔

وعظ و نصیحت کے میدان میں امت سے جو کوتاہیاں ہو رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ ذمے داری بالعموم ان لوگوں نے اٹھا رکھی ہے جو اس کی نزاکتوں سے بے خبر ہیں۔ دوسرے یہ کہ بہت سے واعظین نے اسے ایک پیشہ بنا لیا ہے، جس میں وعظ کرنے والا مخاطبین کی بھلائی سے زیادہ اپنا فائدہ چاہتا ہے۔ خودغرضی نے اس مقدس کام کے حسن کو مجروح کر دیا ہے۔ اس سے اس کی تاثیر ختم ہوگئی ہے اور امت کے اندر اس کی قدر و قیمت گھٹ کر رہ گئی ہے۔

ہمارے واعظین کی علمی اور عملی کم زوریوں کی وجہ سے بہت سے ذہین، سمجھ دار اور خداترس افراد بھی 'وعظ' سے گھبراتے ہیں۔ انھیں یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ان کا شمار بھی پیشہ ور واعظوں میں نہ ہونے لگے۔ حالاں کہ یہ کوئی صحیح روش نہیں ہے۔ اس سے پند و موعظت کے جس عمل کو امت میں اعلیٰ معیار پر جاری رہنا چاہیے اسے نقصان پہنچتا ہے۔ دعوت اور امت کی اصلاح و تربیت میں پند و موعظت کا بڑا دخل ہے۔ اس میں امت کی بہترین صلاحیتیں صرف ہونی چاہئیں۔ دعوت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جہاں ضرورت ہو مخاطب کو عقلی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں وعظ و نصیحت سود مند ہوسکتی ہو وہاں وعظ و نصیحت سے کام لیا جائے۔ یہ دونوں کام اپنے مزاج کے لحاظ سے کسی قدر مختلف ضرور ہیں، لیکن داعی کو حسبِ حال انھیں اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی باتیں عقل کو بھی اپیل کرتی ہوں اور ان سے دینی جذبات اور احساسات کو بھی تقویت پہنچے۔ اسے بہ یک وقت حکیم بھی ہونا چاہیے اور واعظ و ناصح بھی۔

موعظت کے اصول اور آداب

قرآن و حدیث میں موعظت کے اصول و آداب بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ ہم دردی اور غم خواری کا مظاہرہ کیا جائے

موعظت میں ہم دردی، دل سوزی اور غم خواری ہونی چاہیے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بغیر موعظت کا تصور ہی مکمل نہیں ہوتا۔ عربی لغت کے ایک بہت بڑے ماہر خلیل نے وعظ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

هو التذكير بالخير فى ما يرقّ له القلب[1] — یہ خیر کی اس طرح تذکیر کا نام ہے، جس سے دل میں رقّت پیدا ہو۔

ایک اور ماہرِ لغت ابن سیدہ کہتے ہیں:

هو تذكيرك للانسان مما يليّن قلبه من ثواب و عقاب[2] — وعظ یہ ہے کہ ثواب اور عذاب کے بیان کے ذریعے تم اس طرح انسان کی تذکیر کرو کہ اس کا دل نرم پڑ جائے۔

قرآن کریم میں موعظہ حسنہ کے ذریعے دعوت کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تفسیر خازن نے ان الفاظ میں کی ہے:

يعنى وادعهم الى الله بالترغيب و الترهيب، و هو انه لا يخفى عليهم انك تناصحهم و تقصد ما ينفعهم[3] — یعنی تم ان کو ترغیب و ترہیب کے ذریعے اللہ کی طرف دعوت دو، اس طرح کہ ان پر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ تم ان کی خیر خواہی کر رہے ہو اور ان کا فائدہ چاہتے ہو۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو دین کی بنیادی باتوں کی نصیحت کی تھی۔ اس نصیحت کو قرآن نے وعظ ہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک باپ اپنی اولاد کو جس خلوص اور محبت کے ساتھ نصیحت کرتا ہے وہ وعظ ہے۔ بسا اوقات انسان مضبوط ترین دلائل کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، لیکن اخلاص اور ہم دردی کے ساتھ کی جانے والی نصیحت اس کے دل میں اتر جاتی ہے اور وہ اس سے منہ موڑنے کی

---

[1] راغب، مفردات القرآن، ۵۴۹

[2] ابن منظور، لسان العرب، مادہ وعظ

[3] خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۴/ ۶۲

ہمت نہیں کر پاتا۔ دلائل کو ٹھکرانے والا انسان بسا اوقات خلوص و محبت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۲۔ موعظت اللہ کے دشمنوں کو بھی کی جائے

دین کے دشمنوں اور اس کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے ساتھ بھی پند و موعظت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ ان کی اصلاح کی ایک موثر تدبیر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں منافقین کا رویہ بالکل واضح تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے سینوں میں نفرت، بغض اور عداوت کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی کام یابی پر حسد سے جلتے تھے اور ان کی ہر ناکامی ان کے لیے مسرت کا پیام لاتی تھی، لیکن اس کے باوجود کہا گیا کہ ان کے ساتھ وعظ و نصیحت کا کارگر طریقہ اختیار کیا جائے اور انھیں اپنی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي انھیں نظر انداز کیجیے، ان کو نصیحت کیجیے اور ان سے
أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ○ (النساء: ۶۳) ان کے نفوس میں اتر جانے والی بات کیجیے۔

مطلب یہ کہ انھیں نصیحت کی جائے، موثر اور بلیغ انداز میں انھیں جھنجھوڑا جائے، بہتر سے بہتر انداز میں انہیں سمجھایا جائے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور انہیں آخرت کی جواب دہی کا احساس دلایا جائے۔

۳۔ نصیحت جہاں فائدے کی توقع ہو

جس شخص کے اندر دین کی طلب ہو اور جو حق کے دریافت ہونے کے بعد اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو، اسے وعظ و نصیحت سے فائدہ پہنچتا ہے، لیکن جو شخص حق کو قبول نہ کرنا چاہے اس کے لیے نصیحت بے سود ہو سکتی ہے۔ اس لیے نصیحت جہاں مفید اور کارآمد محسوس ہو وہاں ضرور کرنی چاہیے اور جہاں اس سے فائدہ کی توقع نہ ہو وہاں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ جب کسی صاحب علم سے

کوئی بات دریافت کی جائے اور وہ اس کا شرعی حکم جانتا ہوتو اسے صاف صاف یہ حکم بتا دینا چاہیے۔ علم کو چھپانا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سئل عن علم علمه ثم كتمه ألجم يوم القيامة بلجام من النار[1]

جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا تھا، پھر بھی اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے روز اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

جہاں علم کی طلب ہو وہاں یہ حکم ہے اور جہاں دین سے بے نیازی دکھائی جائے وہاں حکم ہے کہ دین کے علم بردار کو بھی بے نیازی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نعم الرجل الفقيه في الدين ان احتيج اليه نفع و ان استغنى عنه أغنى نفسه[2]

دین کا وہ فقیہ بہت اچھا ہے کہ اگر اس کے سامنے حاجت رکھی جائے تو فائدہ پہنچائے اور اس سے بے نیازی دکھائی جائے تو وہ خود بھی بے نیازی دکھائے۔

یہ ہدایت بظاہر دینی امور میں استفتا اور فتویٰ سے متعلق ہے، لیکن پند و موعظت میں بھی اسے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لوگوں کے پیچھے پڑ کر نصیحت کرنے سے دین اور علمائے دین دونوں کا وقار مجروح ہوتا ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے بعد موعظت کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔

یہ وعظ و نصیحت کا ایک پہلو ہے، ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا مخاطب کو دین کی طرف لانے کے لیے بھی موعظت ہوسکتی ہے بلکہ ہونی چاہیے، لیکن اس کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔

۴۔ مخاطب اکتاہٹ نہ محسوس کرے

وعظ و نصیحت میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مخاطب اکتاہٹ نہ

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، بحوالہ، احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ
[2] مشکوٰۃ، کتاب العلم بحوالہ رزین

محسوس کرے۔ اس سے وعظ و تذکیر کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے۔ اکتاہٹ روز روز کی نصیحت سے بھی ہوسکتی ہے اور طول طویل نصیحت سے بھی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ہفتہ میں ایک بار جمعرات کو تذکیر فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے عرض کیا کہ کاش آپ روزانہ تذکیر فرماتے (تاکہ زیادہ فائدہ ہو)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس کے جواب میں فرمایا:

انه يمنعني من ذلك اني اكره ان املّكُم و اني اتخو لكم بالموعظة كما كان النبيﷺ يتخولنا بها مخافة السامة علينا[1]

اس پر عمل کرنے میں یہ بات مانع ہے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہیں اکتاہٹ میں ڈال دوں۔ میں موعظت کے معاملے میں تمہارا خیال رکھتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اس معاملے میں ہمارا خیال رکھتے تھے کہ کہیں ہمارے اندر اکتاہٹ نہ پیدا ہوجائے۔

حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا: لوگوں کو حدیث ہفتہ میں ایک مرتبہ سناؤ۔ اگر تم میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتو دو مرتبہ بیان کرو۔ اگر بہت زیادہ کرنا چاہوتو تین مرتبہ بیان کرو۔ اس کا خیال رکھو کہ قرآن مجید سے لوگوں کے اندر بے توجہی نہ پیدا ہونے پائے۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ جب کچھ لوگ کسی گفتگو میں مصروف ہوں تو تم ان کی گفتگو کاٹ کر اپنی بات (نصیحت) کرنا شروع کردو اور وہ تمہاری اس حرکت سے اکتاہٹ اور بے زاری محسوس کرنے لگیں۔ ایسے موقع پر خاموش رہو۔ جب تم سے کہا جائے تو اپنی بات رکھو۔ صرف اس وقت تک گفتگو جاری رکھو جب تک کہ ان کے اندر رغبت پائی جائے۔ دعا میں مسجع اور مقفّع الفاظ استعمال نہ کرو۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اس سے احتراز کرتے تھے۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم ايام معلومة۔ مسلم، کتاب صفات المنافقين و احكامهم، باب الاقتصاد فی الموعظة

[2] بخاری، کتاب الدعوات، باب ما يكره من السجع فی الدعاء

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس نصیحت میں موعظت کے بڑے اہم آداب بیان ہوئے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ان کی پابندی سے موعظت میں جان پڑ جاتی ہے اور اس کا صحیح فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں ان کی پابندی نہیں ہوتی واعظ خطابت کے ذریعے اپنے ذہن کا بوجھ تو ہلکا کرلیتا ہے، لیکن سننے والوں پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ واعظ کا فرض ہے کہ بے نتیجہ وعظ سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

جدالِ احسن

دورِ حاضر میں مذاہب کے درمیان مکالمہ (Dailogue) کا رجحان عام ہے۔ اس کا مقصد کسی مذہب کی حقانیت ثابت کرنا نہیں ہوتا بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ مذاہب کے درمیان مشترک قدریں تلاش کی جائیں اور اختلافی امور زیر بحث نہ لائے جائیں، تاکہ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات نہ ابھریں اور اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا ہو۔ اس سے ایک اور رجحان بھی ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ محرّف مذاہب کے بے دلیل معتقدات پر بھی نقد نہ کیا جائے اور انہیں خاموشی سے تسلیم کر لیا جائے۔ یہ ایک غیر علمی رویہ ہے اور اتحاد کی حقیقی بنیاد بھی نہیں ہے۔

اسلام اہل مذاہب کے درمیان مباحثہ کے خلاف نہیں ہے، اس نے مشرکین اور اہل کتاب دونوں ہی سے مباحثہ کی اجازت دی ہے اور اس میں ضروری آداب کی پابندی کا حکم دیا ہے جسے، وہ 'جدالِ احسن' کہتا ہے۔ وہ مذاہب کے درمیان مشترک بنیادوں کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ ان کے لازمی تقاضوں کو بھی تسلیم کیا جائے۔

'جدالِ احسن' اسلام کے نزدیک دعوتِ حق کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن نے مشرکین اور اہلِ کتاب سے جس طرح مکالمہ کیا ہے اس کی کسی قدر تفصیل یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

مشرکین سے جدالِ احسن

عرب کے مشرکین اللہ تعالیٰ ہی کو کائنات کا خالق و مالک مانتے تھے لیکن اس کے باوجود بہت سے دوسرے خداؤں کی خدائی کے بھی قائل تھے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان ہی کے مسلّمات سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی حکم رانی کو تسلیم کرنا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ایک ایسا رویہ ہے جس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ○ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ○ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ○

(العنکبوت:۶۱۔۶۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا؟ تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ (ان سے کہو کہ) پھر کہاں وہ بہکائے جاتے ہیں؟ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور جس کو چاہے تنگی میں مبتلا کرتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے، (وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کون بارش اتارتا اور اس کے ذریعے مردہ پڑی ہوئی زمین کو زندہ کرتا ہے؟ تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی کرتا ہے۔ کہو، الحمد للہ (اس طرح خود ہی تم نے شرک کی تردید کردی) لیکن ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کائنات تین بنیادوں پر قائم ہے۔ تخلیقِ حیات اور حرکت و عمل۔ ان ہی سے اس کائنات کو وجود ملا ہے اور وہ ایک خاص نظام کے تحت اپنا عمل انجام دے رہی ہے۔ جس ہستی کے قبضے میں یہ تینوں قوتیں ہوں وہی اس کی مستحق ہے کہ اسے خدائی کا مقام حاصل ہو۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین خود اقرار کرتے ہیں کہ یہ تینوں طاقتیں اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہیں، اس میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ پھر بتاؤ کہ تمہارے عقیدہ میں

شرک کہاں سے گھس آیا؟ اور اللہ کے شریک کہاں سے پیدا ہو گئے؟

مشرکین کے اس اعتراف سے کہ کائنات کا سارا اقتدار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جس طرح قرآن مجید نے حجت قائم کی ہے اس کی ایک مثال ذیل میں دی جا رہی ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ○ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ○ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ○ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○

(المؤمنون: ۸۴-۹۰)

(ان سے) کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور اس کی ساری مخلوق کس کی ہے؟ تو وہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ کی ہے۔ کہو تو پھر کیوں نہیں نصیحت حاصل کرتے۔ ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ، ان سے کہو: تو پھر کیوں نہیں اس سے ڈرتے۔ ان سے پوچھو: اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے؟ وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان سے کہو کہ پھر کہاں سے تم پر جادو چل جاتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم نے تو ان کے سامنے حق پیش کر دیا ہے اور اسے وہ جھٹلا رہے ہیں۔

اس طرح مشرکین جن حقیقتوں کو خود تسلیم کرتے تھے ان ہی سے ان پر حجت قائم کی گئی ہے۔

اہلِ کتاب سے جدالِ احسن

قرآن مجید نے اہل کتاب کے ساتھ 'جدال احسن' کے لیے کہا ہے اور اس کی بنیاد بھی فراہم کر دی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ○ (العنکبوت:۴۶)

تم اہل کتاب سے مباحثہ صرف اس طریقہ سے کرو جو سب سے بہتر ہے۔ ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کی راہ اختیار کی ہے ان سے بحث نہ کرو۔ اور کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی ہے اور ان کتابوں کو بھی مانتے ہیں جو تم پر نازل کی گئی ہیں۔ اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم تو اس کے فرماں بردار ہیں۔

قرآن مجید نے اہل کتاب کی فکری و عملی خامیاں واضح کیں۔ اس کے ساتھ ان سے گفتگو کی بنیاد یہ قرار دی کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں اور تم بھی ایک خدا کو مانتے ہو۔ آؤ ہم سب مل کر اس کی شریعت کے پابند ہوجائیں اور سارے خداؤں کی غلامی سے آزاد ہوجائیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ○ (آل عمران:۶۴)

اے نبیؐ! کہو: اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں (یعنی صرف ایک خدا کی اطاعت کرنے والے)۔

اہلِ کتاب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ عبادت صرف اللہ واحد ہی کی ہونی چاہیے، لیکن اس کے باوجود ان کے اندر شرک داخل ہوگیا تھا اور انھوں نے خدا کے بندوں کو خدا بنا لیا تھا۔ یہود (ان کا ایک فرقہ) حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا مانتے تھے اور نصاریٰ کے ہاں حضرت عیسیٰؑ ابن اللہ تھے۔

اہلِ کتاب اصولی طور پر اس بات کو مانتے تھے کہ قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور انسان کو اسی کے قانون کا پابند ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے فرد کو نہ تو قانون دینے کا حق ہے اور نہ اس کی اتباع ہونی چاہیے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ ان کے احکام و فرامین خدائی احکام و فرامین کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر اپنے مفادات کے تحت احکام جاری کرتے تھے۔ قرآن نے اس تضاد کو نمایاں کیا اور اس پر تنقید کی۔ ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (التوبہ:۳۱)

انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالاں کہ ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک اللہ کی اطاعت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

حضرت عدی بن حاتم اسلام لانے سے قبل عیسائی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم نے اپنے احبار و رہبان کو رب نہیں مانا۔ آپؐ نے فرمایا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا اور اس کے محرمات کو حلال کیا اور تم اس پر عمل کرنے لگے؟ انھوں نے اسے تسلیم کیا۔ آپ نے فرمایا: یہی ان کو رب بنانا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اوّلین تقاضا ہے کہ صرف اس کے احکام کی اتباع کی جائے۔ ایک طرف اس کی عبادت کا دم بھرنا اور دوسری طرف احبار و رہبان کو خدا کی طرح فرماں روا اور قانون سازی کا اختیار دینا صریح تضاد ہے، جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔[2]

---

[1] ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، سورۃ التوبۃ۔ معالم التنزیل مع الخازن: ۱۰۸/۳

[2] مکالمہ بین المذاہب اور اہل کتاب کو اسلام کی دعوت پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: 'تجلیاتِ قرآن'، صفحہ ۱۹۹ تا ۲۲۶

آج دنیا پر لامذہبیت کا راج ہے، اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور ہر طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ بہت سے لوگ سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اس کا علاج مذہب اور اخلاق کے اندر ہے لیکن اس کا کوئی واضح تصور ان کے ذہنوں میں نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے اس احساس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ اسلام انسان کی ایک حقیقی ضرورت ہے۔ اسی سے ہمارے مسائل حل ہوسکتے ہیں، دنیا فتنہ و فساد سے پاک ہوسکتی اور امن و امان قائم ہوسکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور نجات کی ساری راہیں مسدود ہیں۔